مسز طاہرہ حبیب

اقلیّتیں

زمانۂ رسالتؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں

روئے زمین پر اکثر اقوام اور ممالک کی آبادی مذہب، رنگ، نسل اور نظریات کے لحاظ سے مختلف طبقات پر مشتمل ہے، اس لیے ان کے مختلف مذہبی و معاشی اور سیاسی رجحانات کی بنا پر ان میں باہمی روابط، ہم آہنگی اور رواداری کے لیے خوش کن اور منصفانہ حکمتِ عملی کے مسائل ہمیشہ درپیش رہے ہیں۔ ان مسائل اور حالات کے اثرات کسی ملک یا خطے کی جغرافیائی حدود سے چھلک کر عالمی سطح پر بھی مرتب ہوتے ہیں، لہٰذا متعدد مقامات کی اقلیتوں کے حقوق و فرائض کے لیے نت نئے ضابطے اور قانون رقم ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً پہلی جنگِ عظیم کے بعد پیرس میں جو معاہدے ہوئے ان میں مفتوح قوموں کی اقلیتوں کو تحفظ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح اقوامِ متحدہ کے زیرِ انصرام مزدوروں کی عالمی تنظیم انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (آئی ایل او) اور امریکی عالمی حقوق کی کانگریس بھی ان مقاصد کے لیے کوشاں ہیں۔ ان مقاصد اور معاہدات کی بنیاد انسانی سوچ اور نظریات کے مختلف دھاروں پر رکھی جاتی ہے مگر اسلام ایک آفاقی مذہب کی حیثیت سے عالمگیر فطری قوانین اور ضابطۂ حیات کا داعی ہے، اس لیے اس تناظر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے اوّلین دور یعنی عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دورِ خلافتِ راشدہ میں اقلیتوں کے مقام، مراعات، حقوق اور فرائض کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا جائے۔ اس لیے کہ اسلام کی ترویج اور قبولیت میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین

کے حسنِ سلوک اور مساوات کا نہایت اہم حصہ ہے۔

اسلام اپنی غیر مسلم اقلیتوں کو "ذمی" کا نام دیتا ہے۔ ذمی، ذمہ سے مشتق ہے۔ "ذمہ" سے مراد عہد کفالت، حرمت، ذمہ داری اور "حق رجل" ہیں۔ "رجل لہ" وہ شخص ہے جس سے کوئی عہد و پیمان کیا گیا ہو۔ اس لیے اہل العہد اور اہل الذمہ مترادف الفاظ ہیں۔ جوہری نے لکھا ہے کہ اہل العقد کو ہی اہل الذمہ کہا جاتا ہے۔[۲]

اصطلاحی زبان میں یہ وہ ذمہ داری ہے جو اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کی جان، مال اور عزت و حرمت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنے اوپر لے لیتی ہے۔ ایسی غیر مسلم رعایا کو ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا ہے، گویا اہل الذمہ وہ لوگ ہیں جن کے مال، عزت و آبرو اور شہری حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی ریاست کی ہوگی جو بڑی مقدس ہے۔[۳]

اس سلسلے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اپنی غیر مسلم رعایا سے جس تحمل، برداشت اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا، اسے عہدِ اسلام سے قبل اور آج کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔[۴]

ابتدا میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو توحید کی دعوت دینے کی پاداش میں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور خدا کی توحید اور آپؐ کی رسالت کا اقرار کرنے والوں کو کربناک اذیتیں دی گئیں۔ اس کے باوجود جب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکومتِ اسلامی کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:

> "جاؤ تم پر کوئی گرفت نہیں۔ تم میں سے ہر ایک مذہب کے بارے میں آزاد ہے۔ تم ہمارے ذمی ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ تمہاری ہر قسم کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔"[۵]

اسلام صرف قتال میں برسرِ پیکار دشمنوں سے لڑنے کا حکم دیتا ہے بلکہ عین میدانِ کارزار میں بھی دشمنوں کے حقوق اور عزتِ نفس کے احترام کا خیال رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور نابالغوں کی جان لینے سے منع کرتا ہے اور جنگ کی حالت میں بھی مقتول کی شکل بگاڑنے اور زیادتی کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ تاہم اسیرانِ جنگ اور مفتوحین کو اسلام کا پیغام پہنچانا لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے

باوجود لا اکراہ فی الدین کی عملی تفسیر کی وضاحت کرتے ہوئے اسلام میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہیں تو ان پہ ریاست کی طرف سے کوئی عتاب نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مشرکین سے بھی ایفائے عہد کی تعلیم دی گئی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا اور پھر انھوں نے تمہارے ساتھ کچھ قصور نہ کیا اور تمہارے مقابلے میں کسی اور کی مدد نہ کی تو مقررہ مدت تک ان سے عہد پورا کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ احتیاط کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

ارشادِ خداوندی کی تفسیر ہمیں سیرتِ رسولؐ اور احادیثِ مبارکہ سے مل جاتی ہے مثلاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"خبردار، جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کرے یا اس کے حق میں کمی کرے یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو قیامت کے روز میں اُس کا وکیل ہوں گا۔"[۶]

ایک اور جگہ ارشادِ نبویؐ ہے:

"جس شخص نے کسی ذمی کو ستایا تو میں قیامت کے روز اس کی طرف سے مخاصمت کروں گا اور میں نے مخاصمت کی تو میں ہی غالب رہوں گا۔"[۷]

حضورِ اکرمؐ کا ایک اور ارشاد ہے:

"جس شخص نے کسی معاہد کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو تک بھی نہ سونگھ سکے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچ سکتی ہے۔"[۸]

ذمی کی جان اور حرمت کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا:

"جس شخص نے کسی کو جان کی امان دی اور پھر اسے قتل کر دیا، تو میں اس سے بیزار ہوں، اگرچہ مقتول کافر ہو۔"[۹]

اسی طرح دیگر احادیثِ مبارکہ میں بھی مسلمانوں کے لیے جائز شرائط کی پابندی، مغلوب کی جان، مال اور اولاد کی حفاظت اور سلامتی کی تاکید کی گئی ہے۔[۱۰]

ذمی کو کافر یا کوئی اور ناز یبا لفظ کہنے سے بھی ممانعت کی گئی ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ:

"جس شخص نے کسی ذمی کو ستایا وہ ہماری جماعت سے خارج ہے۔"[۱۱]

احادیث میں ذمیوں کے مذہب اور عقاید کے بارے میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ تاہم شروع میں ذمیوں کے زمرے میں اہلِ کتاب یعنی عیسائی اور یہودی شامل تھے لیکن بعد ازاں مسلمانوں نے جتنے بھی علاقے فتح کیے وہاں کے رہنے والوں کو اہلِ ذمہ میں شامل کر لیا گیا۔ مثلاً عراق کے صابئین، شام کی سامرہ قوم، ایران کے زرتشت اور برِصغیر کے ہندو اور بدھ مت کے ماننے والوں کو بھی ذمی قرار دے دیا گیا۔

اہلِ ذمہ

فقہا کے نزدیک ذمیوں کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں:

۱۔ وہ غیر مسلم جنہوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور پھر مغلوب ہو کر اسلامی مملکت کے وفادار شہری بنے۔

۲۔ وہ غیر مسلم، جو جنگ کے بغیر ہی صلح اور معاہدے کے تحت اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے جیسے عہدِ رسالتؐ میں اہلِ نجران اور عہدِ فاروقیؓ میں بنی تغلب نے خاص معاہدے کے ساتھ اسلامی مملکت کی اطاعت قبول کی۔

یہ دونوں فریق شہری حقوق میں بالکل مسلمانوں کے مساوی ہوتے ہیں اور ان سے فوجی خدمات نہیں لی جاتیں بلکہ ان پر ایک نہایت معمولی ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس فریقِ دوم سے اس معاہدے کے تحت لیا جاتا ہے جو بوقتِ مصالحت آپس میں طے ہو جائے۔ اس میں کمی بیشی کا کسی امیر یا سربراہِ مملکت کو اختیار نہیں ہوتا۔[۱۲]

مستامن ایسا غیر مسلم جو کسی دوسری مملکت سے تجارت کی غرض سے عارضی

طور پر اسلامی مملکت میں آیا ہو۔ اسے ایک سال سے زائد قیام کی نہ تو اجازت ہوگی نہ اس پر ذاتی ٹیکس عاید کیا جائے گا۔ تاہم اس پر تجارتی ٹیکس اس شرح سے عاید ہوگا جس شرح سے مسلمان ادا کریں گے، اگر ان کی مملکت میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو پھر بھی اسلامی ریاست ان سے انتقام نہیں لے گی۔ بلکہ صرف تجارتی عشر وصول کرے گی۔ اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اسی طرح کرے گی جس طرح اہلِ ذمہ کی۔[۱۳]

معاہد یا حلیف

تیسری قسم معاہد یا حلیف کی ہے۔ یہ وہ غیر مسلم ہیں جو اسلامی حکومت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں لیکن جن شرائط پر ان کے ساتھ معاہدہ کیا جائے گا ان کی پابندی ظاہری اور باطنی طور پر پوری طرح کی جائے گی۔[۱۴]

حربی

چوتھی قسم حربی کی ہے۔ ایسا غیر مسلم جس سے کسی قسم کا معاہدہ نہ ہوا ہو۔ اسلام نے اسے بھی عام انسانی حقوق دیے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حکم ہے کہ جنگ میں کسی عورت، بچے یا بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے۔ کسی مذہبی پیشوا کو جو عبادت میں مصروف ہو، نہ مارا جائے۔ قتل صرف انہی کو کیا جائے جو قتال کے لیے سامنے آئیں اور ان کے بھی ناک، کان وغیرہ کاٹ کر صورت نہ بگاڑی جائے۔

اس ضمن میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وہ ہدایت نہایت اہم ہے جو انھوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو جنگ پر روانہ کرتے ہوئے دی تھی، جس میں یہ واضح کر دیا تھا کہ:

> "امانت میں خیانت نہ کرنا۔ مال نہ چھپانا۔ بے وفائی سے بچنا۔ مثلہ نہ کرنا۔ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا۔ ہرے بھرے اور پھلدار درخت نہ کاٹنا۔ کھانے کے علاوہ جانوروں کو بے مقصد ذبح نہ کرنا۔"[۱۵]

ان ذمیوں سے ان کی جان، مال، عزت اور آبرو کی حفاظت کے بدلے میں اسلامی ریاست

انتہائی معمولی رقم وصول کرنی ہے، جسے جزیہ کہا جاتا ہے۔

جزیہ کی اصل کے بارے میں دو باتیں بیان کی جاتی ہیں:

اوّل: یہ جزا سے مشتق ہے اور خالص عربی لفظ ہے۔

دوم: فارسی لفظ گزیت یا گزید سے ماخوذ ہے، جس کے معنی فارسی زبان میں خراج کے ہیں[۱۶]۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ جزیہ خالص عربی لفظ ہے وہ اس کے معنی حفاظت کے صلے میں ادا کی جانے والی رقم قرار دیتے ہیں، یعنی یہ لفظ جزا سے نکلا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام جزیہ رکھا گیا ہے اور اس طرح جزیہ کا معاوضہ حفاظت ہونا علمی اور عملی طور پر ہمیشہ مسلّم رہا ہے، اسی خیال نے اکثر اہلِ لغت کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ جزیہ فارسی زبان کا بھی لفظ ہے اور فارسی زبان میں یہ لفظ ایک طرح سے خراج کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔

علامہ مقریزی کا خیال ہے کہ جزیہ کا لفظ ظہورِ اسلام سے قبل بھی عرب میں مستعمل تھا اور نوشیرواں عادل کے عمال یمن اور مضافاتِ یمن میں گزیت کی وصولی کے لیے متعین تھے، یہی لفظ بعد میں معرب ہو کر جزیہ بن گیا[۱۷]۔

مولانا شبلی نعمانی بھی اس خیال سے متفق ہیں کہ جزیہ بطور ٹیکس نوشیرواں عادل کے عہد میں رائج تھا، تاہم بعض محققین نے اس سلسلے میں لفظ "جوالی" بھی استعمال کیا ہے۔ جوالی، جالیہ کی جمع ہے جس کے معنی وہ لوگ ہیں جو اپنا وطن ترک کر کے دوسرے ملک میں آباد ہو گئے ہوں۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> "اگرچہ نوشیرواں اور اس کی رعایا کا ایک مذہب تھا لیکن ان پر جو ٹیکس لگایا گیا تھا، اسے بھی مسلمان جزیہ کہتے ہیں، جس کی تعداد ۱۲ درہم، ۸ درہم، ۶ درہم اور ۴ درہم تک تھی اور حضرت عمرؓ نے ان ہی قاعدوں کی تقلید کی"[۱۸]۔

بلاذری کے نزدیک بھی جزیہ خالصتاً مسلمانوں کی طرف سے عاید کردہ ٹیکس نہ تھا بلکہ ان سے قبل ایران اور بازنطینی سلطنتوں میں رائج رہا تھا[۱۹]۔

ان حقائق سے ان غیر مسلم زعما کے ان خیالات کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ جزیہ کے نفاذ سے غیر مسلم رعایا کی تحقیر مقصود تھی۔ اس کے برعکس یہ تسلسل اس امر کا عکاس ہے کہ مسلمان حکمران، غیر مسلم رعایا کے رسم و رواج اور طرزِ زندگی میں بے جا مداخلت اور ردّ و بدل سے اجتناب کرتے تھے۔

دراصل مسلمانوں کا نافذ کردہ جزیہ فوجی خدمات سے استثنا کا معاوضہ تھا اور اسلام میں اس کی مقدار بہت کم اور ذمی کی استطاعت کے عین مطابق تھی اور اپاہج، بیمار، بوڑھے، نادار، فقیر ناکارہ، اندھے، پجاری اور راہب سے جزیہ نہ لیا جاتا تھا۔ اسی طرح عورتیں اور نابالغ بچے بھی جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔[۲۰]

بلکہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد الدینوری نے تو یہاں تک کہا ہے کہ بڑے بڑے خاندانی شرفا، فوجیوں، مذہبی لوگوں، ادیبوں، انشاپردازوں اور شاہی خدمت گاروں کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔[۲۱]

اس رقم کے عوض ان عیسائیوں کو فوجی خدمات سے نہ صرف مستثنیٰ قرار دیا گیا بلکہ اسلامی ریاست نے انہیں وہ تمام حقوق اور مراعات دیں جو مسلمانوں کے پاس اس وقت موجود تھیں۔ انہیں اسلامی ریاست کا شہری بنا کر برابری کا درجہ دیا گیا۔[۲۲]

جزیہ کی جو مقدار مقرر کی گئی، اس کی صورتحال مختلف ادوار میں مختلف رہی۔ دورِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حضورؐ نے حالت و موقع کے مطابق اور باہمی رضامندی کا لحاظ کرکے جزیہ مقرر کیا۔ مثلاً اہلِ نجران کے ساتھ دو ہزار حلہ صفر اور دو ہزار حلہ رجب کے مہینے میں لینے منظور فرمائے، جن کی قیمت ایک اوقیہ تھی اور ایک اوقیہ کا وزن ۴۰ درہم تھا لیکن جو حلے ایک اوقیہ سے زیادہ کے ہوں گے ان کی قیمت حلوں کی تعداد کی کمی سے اور جو اس سے کم قیمت کے ہوں گے ان کی قیمت کمی بیشی سے پوری کرائی جائے گی اور اگر وہ ان حلوں کے بدلے اسی قیمت کا اسلحہ، گھوڑے، اونٹ یا اور چیزیں دیں گے تو وہ بھی قبول کر لی جائیں گی۔[۲۳]

اورزخ والوں سے ہر رجب کے مہینے میں سو دینار ادا کرنے پر مصالحت ہوئی اور مقضا کے باشندوں سے ان کے ہاں سے کپڑوں اور پھلوں کے چہارم حصہ سالانہ لیتے رہنے پر صلح کی گئی۔[۲۴]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں بھی جزیہ کی خاص مقدار مقرر نہ تھی بلکہ فریقین کی باہمی افہام و تفہیم کی بنا پر جزیہ وصول کیا جاتا رہا۔

ان کے دور میں سب سے پہلا مفتوح شہر بُصری تھا۔ آپ نے وہاں کے باشندوں کو اختیار دیا تھا کہ وہ جزیہ دیں یا اسلام قبول کر لیں۔ یہ لوگ جزیہ دینے پر رضامند ہو گئے تو آپ نے ہر بالغ مرد پر ایک دینار نقد اور ایک جریب گندم سالانہ کے حساب سے جزیہ عاید کیا۔ بعد ازاں حوران اور مآب کے لوگوں سے بھی حضرت ابو عبیدہؓ نے انہی شرائط پر صلح کی۔[۱]

البتہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا تو یہ نظام نسبتاً منظم اور جامع بنیادوں پر استوار ہوا اور رعایا کی آمدنی کے مطابق جزیہ کی خاص مقدار متعین کر دی گئی۔

جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ :

> حضرت عمر فاروقؓ کا حکم تھا کہ جس کی داڑھی اور مونچھ آ گئی ہو، اس پر جزیہ مقرر کر دو۔ اسی طرح دولت کے اعتبار سے طبقات مقرر کر دیے گئے مثلاً جن کے پاس سونے کے سکّے ہوں ان سے چار دینار سالانہ، جن کے پاس چاندی کے سکّے ہوں ان سے ۴۰ درہم سالانہ۔ اسی طرح مسلمانوں کی خوراک کے لیے ہر ماہ دومہ (ایک پیمانہ) گیہوں اور تین اسماط زیت (روغن زیتون) ادا کریں؛ اور یہ شرح ہر اس انسان کے لیے تھی جو شام اور جزیرہ میں رہتا تھا۔
>
> اور اسی سے جزیہ کی شرح لوگوں کے درجات کے اعتبار سے متعین ہوئی۔ یعنی بظاہر اچھے مالدار شخص پر ۴۸ درہم سالانہ، متوسط الحال پر ۲۴ درہم سالانہ اور غربا پر ۱۲ درہم سالانہ ___ لیکن وہ ممالک اس قاعدے سے خارج تھے جن کی فتح کے وقت کوئی خاص قاعدہ طے ہوا ہو۔ مثلاً حضرت عمرو بن العاصؓ کے ساتھ مصر کی صلح کے وقت طے ہوا تھا کہ شریف، باوضع، سمجھدار، جوان اور بالغ قبطی دو دو دینار ادا کریں گے۔ نابالغوں اور عورتوں پر جزیہ نہیں ہوگا اور جو مسلمان ان کے ملک میں آئیں گے وہ ان

کی تین دن دعوت کریں گے۔[۲۶]

ملک عراق میں ایک دینار فی کس سالانہ جزیہ مقرر کیا گیا۔

بہر حال یہ ۴ درہم ماہوار سے زیادہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ عام شہروں میں ایک اور دو درہم ماہوار تھا لیکن ۲۰ برس سے کم اور ۵۰ برس سے زیادہ عمر والوں، عورتوں، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مجنون، مفلس یعنی جس کے پاس ۲۰۰ درہم سے کم ہو، سب کو معاف تھا۔[۲۷]

صرف ان ذمیوں پر واجب تھا جو:

۱۔ مرد، طاقتِ جنگ رکھتا ہو

۲۔ عاقل ہو

۳۔ محنتی اور دست کار ہو

اور اگر ذمی تمام سال بیمار رہا ہو، کام کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر سے جزیہ ساقط تھا۔

اگر کوئی ذمی کسی وقت ایک دینار دینے کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس سے یہ بھی کم کر دیا جائے گا۔ اسلام نے ذمیوں کی یہاں تک رعایت رکھی ہے کہ حضرت عمرؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ ایک بوڑھے ذمی کو پاس سے گزرتے دیکھا جو در بدر بھیک مانگ رہا تھا تو بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کر دیا۔[۲۸]

حضرت عثمان غنیؓ نے سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقوں پر عمل کیا۔ آپ کے دور میں افریقہ کے کچھ علاقے فتح ہوئے تو ان سے جزیہ قبول کیا اور انہیں اہلِ ذمہ کی حیثیت دی۔

حضرت علیؓ نے بھی ذمیوں سے اپنے پیشروؤں کے طریقِ کار پر عمل کیا بلکہ آپ ان کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چیزیں بھی اس ضمن میں قبول فرما لیا کرتے تھے اور ذمیوں کو مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ انہیں فروخت کر کے نقد پیسہ بطور جزیہ ادا کریں۔[۲۹]

جزیہ وصول کرنے کے بعد بیت المال میں جمع کیا جاتا تھا اور پھر اسے جن کاموں میں خرچ کیا جاتا تھا ان میں مندرجہ ذیل کام شامل تھے۔

۱۔ لشکر کی آراستگی

۲۔ سرحدوں کی حفاظت

۳۔ قلعوں کی تعمیر

۴۔ سڑکوں اور پلوں کی مرمت اور دیگر رفاہی مقاصد۔

قاضی امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ بلاشبہ اس طرح اس خاص رقم سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا اور پہنچنا بھی چاہیے تھا کیونکہ مسلمان لڑائیوں میں شریک ہوتے تھے، جانیں لڑاتے، ملک کو خطرات سے بچاتے اور ان کے جسم و جان سے ذمی رعایا کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو آپؐ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں کئی واقعات ملتے ہیں جن میں ذمیوں کی جان کو مسلمانوں کی جان کے برابر سمجھا گیا اور قصاص کا حکم ملا۔

ذمیوں کی شخصی آزادی کی یہاں تک ضمانت تھی کہ اگر کوئی ذمی دشمن کے قبضے میں آجائے اور اس کی رہائی فدیہ پر منحصر ہو تو اس کا فدیہ مسلمانوں کے بیت المال سے ادا کیا جائے گا۔

جان کی طرح مال کی حفاظت بھی اسلامی ریاست نے بہترین طور پر کی۔

قاضی ابو یوسف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ:

"میرے کھیت میں زراعت تھی۔ اسے حال ہی میں شام کی ایک فوج نے پامال کر دیا ہے"۔

حضرت عمرؓ نے اس ذمی کو بیت المال سے دس ہزار درہم دلوا دیے[۳۰]۔

بعد کے اسلامی ادوار میں بہت سے غیر مسلموں کو بڑے بڑے عہدوں پر بھی تعینات کیا گیا اور اسلامی معاملات میں بھی انہیں مساوی حقوق دیے گئے حتیٰ کہ اسلامی حسنِ سلوک اور رواداری کی یہ صورت حال آج کے دور میں بھی موجود ہے!

O

حواشی

P.R. Palmer and Joel Cotton, *A History of the Modern World* Alfred A. Knopf, New York, 1968, pp. 694-703.

۲۔ مولانا غلام رسول مہر۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۰، ص ۲۹۔ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۱ء

۳۔ ابوداؤد، نسائی۔ بحوالہ محمد اسحٰق سندیلوی: اسلام کا سیاسی نظام۔ ص ۲۲۴۔ معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء

Hitti, Phillips K., *History of the Arabs*, Macnillan and Co., London 1949, p. 233.

۵۔ ملک یوسف الرحمٰن۔ اسلام اور غیر مسلم رعایا۔ ص ۱۴، ۱۵

۶۔ کنز العمال۔ جلد ۲۔ ص ۲۷۰

۷۔ ایضاً

۸۔ نسائی، ابنِ ماجہ۔ مسند احمد عن ابی عمرو

۹۔ نسائی، بخاری فی التاریخ، بحوالہ مولانا محمد شفیع۔ دستورِ قرآنی ضمیمہ۔ ص ۵۔ کراچی ۱۹۵۳ء

۱۰۔ کتاب الجہاد: مشکوٰۃ شریف (اردو ترجمہ) ج ۲۔ ص ۳۱۸۔ سعید اینڈ سنز کراچی۔

۱۱۔ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی۔ آئینہ حقیقت نما۔ جلد ۱، ص ۸۸۔ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۸ء

۱۲۔ مولانا محمد شفیع۔ دستورِ قرآنی۔ ص ۱۱

۱۳۔ احسن المسائل۔ ص ۲۱۰۔ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۹۰ھ

۱۴۔ مولانا محمد شفیع۔ دستورِ قرآنی۔ ص ۱۲

۱۵۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ تاریخِ اسلام۔ حصہ اوّل۔ ص ۱۱۰۔ معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء

۱۶۔ ترجمہ محمد حلیم انصاری۔ کراچی ۱۹۶۴ء

۱۷۔ جرجی زیدان۔ تاریخ تمدن اسلام۔ ج ۱' ترجمہ محمد حلیم انصاری۔ شوکت علی اینڈ سنز
کراچی ۱۹۶۴ء

۱۸۔ شبلی نعمانی۔ الجزیہ: ص ۴۔ مجتبائی پریس لاہور ۱۸۹۱ء

۱۹۔ بلاذری۔ فتوح البلدان۔ ص ۲۷۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۴ء

۲۰۔ فتاویٰ عالمگیری۔ جلد ۲ ص ۶۵۔ پاکستان ایجوکیشنل پریس لاہور

۲۱۔ مسٹر ڈینیل سی ڈینٹ جونیئر: الجزیہ اور اسلام: ترجمہ مولانا غلام رسول مہر۔ ص ۲۷۔
علمی پریس لاہور ۱۹۶۲ء

۲۲۔ ابوحنیفہ احمد بن داؤد الدینوری۔ الاخبار الطوال۔ ص ۲۷: ترجمہ از مرزا محمد منور۔
میزان پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۶۶ء

۲۳۔ مولانا محمد شفیع۔ دستورِ قرآنی۔ ص ۵

۲۴۔ بلاذری۔ فتوح البلدان۔ ص ۱۰۶

۲۵۔ جرجی زیدان۔ تاریخ تمدن اسلام۔ ترجمہ محمد سلیم انصاری۔ حصہ اول۔ ص ۲۷۸

۲۶۔ مولانا غلام رسول مہر۔ الجزیہ والاسلام۔ ص ۶۶

۲۷۔ جرجی زیدان: محمد سلیم انصاری: تاریخ تمدن اسلام۔ حصہ اول۔ ص ۲۰۹

۲۸۔ بلاذری۔ فتوح البلدان۔ ص ۵۹

۲۹۔ سراج الدین احمد: سیرتِ فاروقؓ۔ ص ۱۴۷۔ منشی فضل دین لاہور ۱۸۵۹ء

۳۰۔ محمد یوسف اصلاحی۔ فقہ اسلامی۔ ص ۱۴۲۔ البدر پبلیکیشنز۔ لاہور